کتنی بیبیاں، شہر مبارک کی بیبیاں ـــــ جہان آباد کے کنوئیں بیبیوں کی لاشوں سے پٹے پڑے ہیں۔ جنہیں آفتاب نے ننگے سر نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجمع عام میں بے ردا ہیں۔ اے شہر کیوں کہ تو نے تقدیس حاصل کی، کیوں کہ تو بے حرمت ہوا۔ افسوس ہے تیرے اجڑے کوچوں پہ اور ان پر جنہوں نے تجھے اُجاڑا حالانکہ وہ تیرے ہی فیض یافتہ تھے۔ شہر کیوں کہ تقدیس حاصل کرتے ہیں، کیوں کہ بے حرمت ہوتے ہیں، ان ہی کے ہاتھوں جو ان سے فیض پاتے ہیں اور انہیں مقدس جانتے ہیں۔ پھر اس پوتر نگری کی پوترتا کہاں چلی گئی؟ اس کا رکھشک بانسری کو توڑ، گھرے کو پھوڑ کن بنوں میں نکل گیا اور سفید سانپ اس گیانی کے منہ سے نکلا اور لہراتا ہوا ساگر کی لہروں سے جا ملا۔ اول پانی آخر پانی۔ اوم شانتی، شانتی، شانتی۔ والعصر ان الانسان لفی خسر۔ مثال ان لوگوں کی مکڑی کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور بودے گھروں میں سب سے بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ سو افسوس ہے ان بستیوں پہ جنہیں چیخ نے آلیا یا پانی کا ریلا بہا لے گیا، یا ہوا، یا آگ۔ کتنی حویلیاں اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ کتنے ٹھنڈے میٹھے پانی والے کنوئیں خاک سے اٹ گئے۔ نیک بیبیوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک ایک صحرائے لق ودق ہے۔ خاص بازار، اُردو بازار، خانم کا بازار، سب بازار کہاں گئے۔ نہ سقے دکھائی دیتے ہیں، نہ کٹورا بجتا ہے۔ اوراقِ مصور ایسے کوچے بکھر گئے۔ اب خرابہ ہوا جہان آباد ـــــ لمبی چپ کے بعد شاکیہ منی نے زبان کھولی "بھکشو و تنک اس گھر کو دھیان میں لاؤ جو چاروں اور سے جل رہا ہے۔ بھیتر اس کے کچھ بالک بھٹک رہے ہیں اور سہمے ہوئے ہیں سہمے بھکشو و نرناری بالک ہیں کہ دہڑ دہڑ جلتے گھر کے بھیتر بھٹک رہے ہیں"

زمانے کی قسم، آدمی گھاٹے میں ہے۔

"اے میرے بیٹے! تو نے بستیوں کو کیسا پایا؟"

"میرے باپ، میں نے بستیوں کو بے آرام دیکھا۔ مشرق مغرب شمال جنوب میں

شادمانی اور شادابی کے کھوج میں سب سمتوں میں گیا، ہر سمت میں میں نے آدم کے بیٹوں کو دکھی اور پریشان پایا۔"

"میرے بیٹے، تو نے اس شئے کو کھوجا جو اس چرخ نیلی فام کے نیچے نہیں پائی جاتی۔"

"پھر اے میرے باپ، تو مجھ سے کیا کہتا ہے؟"

"میں تجھ سے وہی کہوں گا جو داؤد کے بیٹے نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میرے بیٹے بکھری ہوئی بدلیاں پھر سے اکٹھی ہوا نہیں کرتیں۔ برسے بادل پھر نہیں برستے۔ سو اس سے پہلے کہ چڑیاں چپ ہو جائیں اور چکی کی آواز تھم جائے اور اس سے پہلے کہ جھانکنے والیاں دھندلا جائیں اور گلی کے کواڑ بند ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے پہ پھوڑا جائے اور۔۔"

"کا کے، تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

اس نے چونک کر افضال کو دیکھا جو جانے کب یہاں آیا اور اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا۔

"یار، میں والد کی قبر پہ آیا تھا۔ یہاں آ کے پھنس گیا۔ آج سارا ہنگامہ قبرستان ہی کے آس پاس ہوا۔ مگر تم کس چکر میں یہاں آئے؟"

"وہی قبر کا چکر جو تیرے ساتھ ہے، میرے ساتھ بھی ہے۔ میری نانی بھی یہیں دفن ہے۔۔" اشارہ کرتے ہوئے "وہ ادھر اس کی قبر ہے۔" رکا، ڈھئی آواز میں "یار ذاکر، نانی کی موت نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔۔" چپ ہو گیا۔ دیر تک چپ بیٹھا رہا، خیالوں میں کھویا کھویا۔ پھر آہستہ سے بولا "یار ذاکر، تجھے یہ بات عجب نہیں لگتی؟"

"کیا؟"

"آج کے آشوب میں ہماری ملاقات قبروں کے درمیان۔۔"

وہ تو یہ بھول ہی گیا تھا۔ چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ قبریں ہی قبریں۔ اور اب شام

ہو رہی تھی۔ یار، شام ہو رہی ہے، چلیں۔"

"یہاں سے کہاں چلیں؟" افضال نے معصومیت سے پوچھا۔

"کہیں بھی چلیں۔ یہاں سے چلیں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

سڑک دور تک خالی تھی اور بھری ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک کتنی اینٹیں بکھری پڑی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں، کاروں کے شیشوں کی کرچیاں، ادھ جلے ٹائر۔ ٹریفک سگنل کتنے اپنی بتیوں سے محروم اندھے کھڑے تھے، کتنے خمیدہ ہو گئے تھے۔ خاموشی گزرے ہوئے شور کی غماز۔ عجیب بات ہے، جتنا بڑا ہنگامہ ہوتا ہے، اس کے بعد اتنی ہی گہری خاموشی آتی ہے۔ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اینٹیں اتنی بکھری پڑی تھیں اور کاروں کے شیشوں کی کرچیاں اور ڈھئی ہوئی حویلیوں کا ملبہ۔ سعادت خاں کا کٹڑہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، صاحب رام کا باغ اور حویلی سب ڈھے گئے۔ خاک سے اٹ گئے۔ شاہجہانی مسجد سے راج گھاٹ تک ایک صحرا ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مقام ہو جائے۔ ہرے بھرے شاہ کے مزار پہ پھر وہی مجذوب بیٹھا نظر آیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ڈرا کہ پھر مجھ پہ گرجے گا۔ مگر آج اس کی گرجدار آواز نہیں آئی۔ تب میں خود آگے بڑھا۔ مودب ہو کر پوچھا۔ "شاہ صاحب، آگے کیا دیکھتے ہو؟"

"جو ہو چکا ہے پھر وہی ہوگا۔"

"وہ تو ہو رہا ہے۔"

قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ گرج کر کہا:

"چلا جا۔ آگے بتانے کا حکم نہیں ہے۔"

میں چلا آیا۔

"یار ذاکر!" افضال رکا، پھر بولا: "لگتا ہے۔ بہت ہنگامہ ہوا ہے۔"

اصل میں وہ سڑک پہ پڑے خون کے دھبے دیکھ کہ سہم گیا تھا۔

"ہاں لگتا یہی ہے۔"

"لوگ ظالم ہو گئے ہیں۔" افضال بڑبڑایا۔

ظالم، افضال کی زبان سے یہ لفظ سن کہ وہ کچھ چونکا، پہ خاموش رہا۔

دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ بس چل رہے تھے، ساتھ ساتھ مگر ایک دوسرے سے بے تعلق۔

"شیراز بھی۔" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا کہ دونوں بغیر کسی ارادے کے چلتے چلتے شیراز کی طرف آ نکلے تھے اور اسے دیکھ کہ ٹھٹک گئے تھے۔

شیراز بند پڑا تھا مگر اس طور کہ اس کے دروازوں کے سب شیشے چکنا چور تھے۔ دیوار اور دروازوں پہ کالونس پتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پیشانی پہ آویزاں سائن بورڈ جل پھنک کہ زمین پہ عین دروازے کے سامنے گرا پڑا تھا۔ اینٹیں اتنی بکھری پڑی تھیں۔ کہ باہر سے اندر تک بکھری نظر آ رہی تھیں۔ تو گویا یہاں بھی بلہ بولا گیا تھا اور یہاں بھی آگ لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دونوں بس ٹکٹکی باندھے شیراز کو دیکھتے رہے۔ پھر وہیں فٹ پاتھ پہ بکھری اینٹوں اور شیشوں سے بچ کہ بیٹھ گئے۔

چپ بیٹھے رہے اور شام کا دھندلکا پھیلتا رہا۔ سامنے کی سڑک گہری خاموشی میں تھی نہ قدموں کی آہٹ نہ سواری کا شور۔ پھر اس جھٹپٹے میں ایک سایہ دکھائی دیا کہ اسی طرف آ رہا تھا اس نے غور سے دیکھا کہ کون ہے "عرفان" اس نے دل ہی دل میں کہا اور اس کی آنکھوں میں امپیریل کی صندلی بلی پھر گئی، جب ایک خاموش شام کو اس راہ سے گزرتے ہوئے اس نے اسے امپیریل کے ملبے میں بھٹکتے دیکھا تھا۔

عرفان نے اُسے اور افضال کو بیٹھے ہوئے دیکھا بغیر کسی تعجب کے۔ پھر بغیر بولے، بات کئے برابر میں بیٹھ گیا۔ تینوں بت بنے بیٹھے تھے۔ گہری ہوتی شام کے جھٹپٹے میں تین ساکت

پرچھائیاں۔

اچانک افضال اُٹھ کھڑا ہوا جیسے خاموش اور ساکت بیٹھے بیٹھے اسے خفقان ہونے لگا ہو۔ دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا "یار، تم دو اچھے آدمی ہو مجھے معاف کر دو۔ میں شہر کی حفاظت نہیں کر سکا۔"

دونوں نے اسے خاموش نظروں سے دیکھا، دیکھتے رہے۔ عرفان کو افضال کے اس انداز بیان پر آج کوئی جھنجھلاہٹ نہیں ہوئی۔

افضال کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ گیا، پھر آہستہ سے بولا:

"یار، ہم بھی طبیب نہیں ہیں۔" دونوں کو دیکھا "ہم ظالم ہیں۔ ہم بھی۔"

اس نے افضال کو خاموش نظروں سے دیکھا، "میں ظالم ہوں۔" وہ افضال کے بیان میں اصلاح کرنا چاہتا تھا یا شاید اپنے طور پر بڑبڑایا تھا۔

افضال نے جیب سے نوٹ بک نکالی، ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی، قلم سے سارے ناموں پر سیاہی پھیر دی "کوئی طبیب آدمی نہیں ہے۔"

عرفان نے نہ اس نے، دونوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ دیر تک تینوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر وہ قدرے بے چین ہوا۔

"یار" وہ عرفان سے مخاطب ہوا "میں اسے خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

"اب؟" عرفان اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں اب۔"

"اب جب کہ ——" عرفان پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا، بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"ہاں اب جب کہ ——" کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اور طرف نکل گیا "اس سے پہلے کہ ——" اُلجھ کر چپ ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ ـــــ اس نے اپنے ذہن میں سلجھنے کی کوشش کی ـــــ اس سے پہلے ـــــ اس سے پہلے کہ اس کی ٹانگ میں چاندی بھر جاتے اور چڑیاں چپ ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ چابیوں کو زنگ لگ جاتے، اور گلی کے کوڑا بند ہو جائیں ـــــ اور اس سے پہلے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جاتے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے پہ پھوڑا جائے اور چندن کا پیڑ اور ساگر میں سانپ اور ـــــ

"چپ کیوں ہو گئے؟" عرفان اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"خاموش۔" افضال نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کر عرفان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ بشارت ہو گی۔"

"بشارت؟ اب کیا بشارت ہو گی؟" عرفان نے تلخ مایوس لہجے میں کہا۔

"کاکے، بشارت ایسے ہی وقت میں ہوا کرتی ہے، جب چاروں طرف ـــــ" کہتے کہتے رکا۔ پھر سرگوشی میں بولا:

"یہ بشارت کا وقت ہے ـــــ"